Historical Consciousness in the Poetry of Allama Iqbal

علامہ اقبال کی شاعری میں تاریخی شعور

Amjad Ali *[1]
PhD Scholar, Department of Urdu, Imperial College Of Business Studies, Lahore.
Dr.Nasim Haneef*[2]
Assistant Professor, Department of Urdu, Imperial College Of Business Studies, Lahore.

امجد علی ☆[1]
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، امپیریل کالج آف بزنس اسٹڈیز، لاہور
ڈاکٹر نسیم حنیف ☆[2]
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، امپیریل کالج آف بزنس اسٹڈیز، لاہور

Correspondance:amjadalianjum15@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 19-07-2026
Accepted:24-09-2026
Online:26-09-2026

Copyright:© 2026 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Allama Muhammad Iqbal's poetry embodies a profound historical consciousness through which he interprets the rise and decline of civilizations, the intellectual heritage of Islam, and the political and cultural challenges confronting the Muslim world. For Iqbal, history is not merely a chronological record of past events; rather, it is a dynamic source of collective awareness, moral instruction, and civilizational renewal. His poetry draws extensively upon Qur'anic narratives, significant personalities of Islamic history, and the cultural achievements of Muslim civilization. Figures such as Prophet Ibrahim, Prophet Musa, Tariq ibn Ziyad, Sultan Tipu, and other historical personalities appear as symbols of faith, courage, selfhood, and resistance. Iqbal critically examines the decline of Muslim societies, attributing it to intellectual stagnation, political subjugation, spiritual weakness, and the abandonment of creative action. At the same time, he challenges

colonial historiography and seeks to restore confidence in the cultural identity and historical legacy of Muslims. His concept of Khudi connects individual self-realization with collective revival and transforms historical memory into a force for future reconstruction. This study examines the major dimensions of historical consciousness in Iqbal's Urdu and Persian poetry through an analytical and interpretative approach. It concludes that Iqbal employs history not to glorify the past nostalgically but to awaken the present generation, encourage critical self-evaluation, and envision a progressive future founded upon spiritual freedom, purposeful action, and civilizational dignity.

KEYWORDS: Allama Iqbal, historical consciousness, Islamic history, Muslim civilization, Khudi, cultural identity, colonialism, civilizational revival

علامہ محمد اقبال بیسویں صدی کے ممتاز شعرا اور مفکرین میں شمار ہوتے ہیں جن کی شاعری صرف ادبی حسن کی حامل نہیں بل کہ ایک ہمہ گیر فکری، فلسفیانہ اور تہذیبی نظریے کی نمائندہ بھی ہے۔ انہوں نے اپنے عہد میں مسلم دنیا، خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کو سیاسی کم زوری، فکری انحطاط اور تہذیبی انتشار کے ایسے دور سے گزرتے ہوئے دیکھا جس کے نتیجے میں قوم میں مایوسی، بے عملی اور احساسِ کم تری فروغ پا رہا تھا۔ اقبال نے اس صورتِ حال کو محض ایک تاریخی حقیقت کے طور پر قبول کرنے کے بجائے اپنی شاعری کو اصلاحِ ملت، بے داریِ شعور اور تعمیرِ کردار کا مؤثر وسیلہ بنایا۔ ان کے نزدیک شاعری کا اصل مقصد صرف جذبات کی عکاسی نہیں بل کہ فرد اور معاشرے میں فکری انقلاب پیدا کرنا بھی ہے۔

اقبال کے فکری نظام کا ایک بنیادی عنصر تاریخی شعور ہے۔ وہ تاریخ کو محض ماضی کے واقعات کا ریکارڈ نہیں سمجھتے بل کہ اسے ایک ایسی زندہ اور متحرک قوت قرار دیتے ہیں جو قوموں کی فکری تشکیل، تہذیبی شناخت اور مستقبل کی سمت کے تعین میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ ان کے نزدیک جو قومیں اپنے تاریخی ورثے، فکری روایت اور اجتماعی تجربات سے آگاہ رہتی ہیں، وہی اپنے حال کو بہتر انداز میں سمجھنے اور مستقبل کی تعمیر کی صلاحیت حاصل کرتی ہیں۔ اس کے برعکس، تاریخ سے بے خبری قوموں کو اپنی شناخت سے دور کر دیتی ہے اور ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

تاریخی شعور سے مراد وہ فکری آگہی ہے جس کے ذریعے فرد یا قوم اپنے ماضی کے تجربات، عروج و زوال کے اسباب اور تاریخی ارتقا کو سمجھتے ہوئے حال کا تنقیدی جائزہ لیتی اور مستقبل کے لیے مؤثر لائحۂ عمل مرتب کرتی ہے۔ اس تصور میں محض ماضی کی یاد یا اس پر فخر کرنا شامل نہیں بل کہ تاریخ سے سبق حاصل کر کے اسے تعمیری اور عملی انداز میں بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں یہ عنصر نمایاں طور پر موجود ہے۔ وہ اسلامی تاریخ کے درخشاں ادوار، عظیم شخصیات، مجاہدین اور مصلحین کی جدوجہد کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے امتِ مسلمہ کی موجودہ صورتِ حال کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں مستقبل کی تعمیر کی دعوت دیتے ہیں۔۔ خلیفہ عبدالحکیم رقم طراز ہیں:

"شعر میں اقبال نے جو موتی پروئے ہیں ان کے متعلق محض یہ کہ دینا ناانصافی ہوگی کہ وہ موتی اُس نے دوسرے جوہریوں سے لیے ہیں۔ ہیرا جب تک تراشا نہ جائے اور موتی جب تک مالا میں پرویا نہ جائے اور جواہرات جب تک زیور میں جڑے نہ جائیں، ان کا جمال معمولی سنگ ریزوں اور خزف پاروں سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اقبال نے شاعری پر جو احسان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مشرق اور مغرب اور ماضی اور حال کے وہ جواہر پارے جو نفس انسانی کے تارے ہیں کمال شاعری سے اس طرح تراشے اور پروئے اور جڑے ہیں کہ نوعِ انسانی کے لیے ہمیشہ کے لیے بصیرت افروز ہو گئے ہیں۔"[1]

اقبال تاریخ کو اس روایتی زاویۂ نظر سے نہیں دیکھتے جس میں اسے صرف ماضی کے واقعات کے زمانی ترتیب کے ساتھ بیان تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک تاریخ ایک فعال، متحرک اور اثرانگیز قوت ہے جو قوموں کی فکری، تہذیبی اور اجتماعی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اگرچہ اقبال نے فلسفۂ تاریخ پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، تاہم ان کی شاعری، خطبات اور نثری تحریروں کا مطالعہ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ تاریخ کے بارے میں ایک واضح، منظم اور فکری نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک تاریخی شعور دراصل قوم کی اجتماعی شناخت اور خود آگہی کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ جس طرح فرد اپنی ذات، اپنی صلاحیتوں اور اپنے مقصد کو پہچان کر مثبت کردار ادا کرتا ہے، اسی طرح کوئی قوم بھی اپنے تاریخی پس منظر، اجتماعی تجربات اور تہذیبی ورثے سے آگاہ ہوئے بغیر ترقی اور استحکام کی منزل طے نہیں کر سکتی۔ اس اعتبار سے تاریخ محض ماضی کی یادگار نہیں بل کہ ایک ایسا فکری آئینہ ہے جو قوم کو اس کی کامیابیوں، کوتاہیوں اور آئندہ امکانات سے روشناس کراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں تاریخ محض ایک علمی موضوع کے طور پر نہیں بل کہ بے داری، حرکت اور اجتماعی تبدیلی کی محرک قوت کے طور پر جلوہ گر ہوتی ہے۔

فلسفۂ خودی اقبال کی فکر کا بنیادی ستون ہے اور ان کا تصورِ تاریخ بھی اسی فلسفے سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کسی جامد یا محدود انفرادی وجود کا نام نہیں بل کہ ایک ایسی تخلیقی اور ارتقائی قوت ہے جو مسلسل عمل، جدوجہد، خود احتسابی اور کردار سازی کے ذریعے نشوونما پاتی ہے۔ جس طرح فرد کی شخصیت اس کے تجربات، اعمال اور فیصلوں کے تسلسل سے تشکیل پاتی ہے، اسی طرح کسی قوم کی اجتماعی خودی بھی اس کے تاریخی سفر، تہذیبی ورثے، اجتماعی تجربات اور قومی یادداشت کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔ اس لیے اقبال کے نزدیک تاریخ سے وابستگی درحقیقت قوم کی اجتماعی خودی کو مضبوط بنانے کا ذریعہ ہے، کیوں کہ تاریخی شعور قوم کو اپنی شناخت برقرار رکھنے اور مستقبل کے لیے بہتر سمت متعین کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

گراں بہا ہے تو حِفظِ خودی سے ہے ورنہ
گُہَر میں آبِ گُہَر کے سوا کچھ اور نہیں (۲)

اقبال کی فکر میں تاریخ اور خودی ایک دوسرے سے گہرا اور ناگزیر تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی قوم کی اجتماعی خودی اس وقت تک مضبوط بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنے تاریخی سفر، تہذیبی ورثے اور اسلاف کی فکری و عملی خدمات سے آگاہ نہ ہو۔ ماضی کے تجربات، کامیابیوں اور ناکامیوں کا شعوری ادراک ہی قوم کو اپنی اصل شناخت اور اجتماعی کردار کا احساس دلاتا ہے۔ اس لیے تاریخی آگہی، اجتماعی خودی کی تشکیل اور استحکام کا بنیادی ذریعہ بن جاتی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے تاریخی ورثے سے لاتعلق ہو جائے تو وہ رفتہ رفتہ اپنی شناخت، اپنے فکری تشخص اور اپنے اجتماعی نصب العین سے بھی دور ہو جاتی ہے، کیوں کہ اس کے پاس اپنی سمت متعین کرنے کے لیے کوئی مضبوط فکری بنیاد باقی نہیں رہتی۔

اسی وجہ سے اقبال اپنی شاعری میں مسلمانوں کو بار بار ان کے ماضی کی یاد دلاتے ہیں، لیکن ان کا مقصد انہیں ماضی پرستی کی طرف مائل کرنا نہیں بل کہ ان کے اندر وہ اعتماد، حوصلہ اور فکری توانائی پیدا کرنا ہے جو ان کے اسلاف کے کردار سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کے نزدیک تاریخ کا مطالعہ اسی وقت مفید ہے جب وہ حال کی اصلاح اور مستقبل کی تشکیل میں عملی کردار ادا کرے۔ اس اعتبار سے تاریخی شعور ایک متحرک اور تعمیری عمل ہے جو ماضی کے تجربات کو موجودہ حالات سے جوڑتے ہوئے مستقبل کے امکانات کو روشن کرتا ہے۔ یوں فلسفۂ خودی اور تاریخی شعور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں؛ خودی تاریخ کو مقصد اور معنویت عطا کرتی ہے، جب کہ تاریخ خودی کو تجربہ، سمت اور فکری بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اسی تناظر میں اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ زندہ، باوقار اور بااعتماد قوم وہی ہے جو اپنے تاریخی ورثے سے مسلسل رشتہ قائم رکھے اور اسے اپنی اجتماعی شخصیت کی تعمیر اور قومی ارتقا کے لیے مؤثر انداز میں بروئے کار لائے۔ بالِ جبریل سے ایک شعر دیکھیے:

خودی میں گُم ہے خدائی، تلاش کر غافل!
یہی ہے تیرے لیے اب صلاحِ کار کی راہ(۳)

اقبال کی شاعری میں اسلامی ماضی کا حوالہ صرف تاریخی واقعات کے بیان تک محدود نہیں بل کہ وہ اسے ایک فکری توانائی اور عملی تحریک کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جب وہ عہدِ نبویؐ، خلافتِ راشدہ اور اسلام کے ابتدائی دور کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا مقصد محض گزرے ہوئے زمانے کی عظمت بیان کرنا نہیں ہوتا، بل کہ وہ موجودہ نسل کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسی تہذیبی روایت کی وارث ہے جس کی بنیاد علم، کردار، عدل، حوصلے اور بلند اخلاقی اقدار پر قائم تھی۔ اقبال کے نزدیک اس شان دار روایت کا شعور مسلمانوں کے اندر اعتماد، خود آگہی اور عمل کی نئی قوت پیدا کر سکتا ہے۔ اقبال کی نظر میں ابتدائی اسلامی عہد کی اہمیت صرف سیاسی فتوحات یا حکومتی وسعت کی وجہ سے نہیں تھی، بل کہ اصل امتیاز اُس اخلاقی، روحانی اور فکری انقلاب میں تھا جس نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو نئی سمت عطا کی۔ ان کے نزدیک اخلاص، قربانی، باہمی اتحاد، سادگیِ کردار اور خدا پر پختہ یقین وہ بنیادی صفات تھیں جنھوں نے ابتدائی مسلمانوں کو غیر معمولی قوت عطا کی۔ اقبال اپنی شاعری میں اسی داخلی طاقت کو نمایاں کرتے ہیں اور اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ جدید دور کا مسلمان اگر اپنے زوال سے نکلنا چاہتا ہے تو اسے انھی بنیادی اقدار اور روحانی سرچشموں سے دوبارہ وابستگی پیدا کرنا ہوگی۔ فیض احمد فیضؔ کا خیال دیکھیے:

"اقبال نے مغرب کے بہت سے فلسفیانہ اور سائنسی خیالات کو قابل قدر گردانا اور انہیں ہضم کر لیا۔ مثال کے طور پر ہیگل کا تصور انسان اور تاریخ کے انسانی عمل کا نتیجہ ہونے کا تصور، کانٹ کا عقل مطلق کے بارے میں استدلال، سرمایہ داری اور طبقاتی استحصال کے خلاف مارکس کا شدید ردعمل، نطشے کا آزاد خیال بورژوا اخلاقیات کا رد اور حصول قوت واقتدار کا استحسان، وجدانی علم کی صحت کے حق میں برگساں کی بحث ، آئین سٹائن (Einstein) کا چہار ابعادی زمانی و مکانی تسلسل کا تصور وغیرہ۔ اس کے باوجود ان کا خیال تھا کہ مغرب کے عینی ومادی دونوں قسم کے فلسفے یہاں کے لوگوں کی معاشرتی و نظریاتی صورت حال سے بڑی حد تک مطابقت نہیں رکھتے ، انہیں یہ محکم یقین تھا کہ مذہب اسلام اور ہماری محترم و پاکیزہ روایات یعنی پیغمبر اسلام کی عملی زندگی اور ان کے اقوال ہیں وہ بنیادیں ہیں جو ان کے پیغام کے لیے سند ہو سکتی ہیں۔"(۴)

نظم "طارق کی دعا" میں اقبال نے اُس عزم اور یقین کی تصویر کشی کی ہے جو ایک مجاہد کو ہر رکاوٹ کے باوجود آگے بڑھنے پر آمادہ رکھتا ہے۔ نظم "طارق کی دعا" میں اقبال نے اُس غیر معمولی حوصلے، یقینِ محکم اور مقصد سے وابستگی کو نمایاں کیا ہے جو ایک مردِ عمل کو مشکلات کے باوجود جدوجہد پر قائم رکھتا ہے۔ اس نظم میں طارق بن زیاد کی زبان سے ادا ہونے والے جذبات دراصل صرف ایک تاریخی شخصیت کی ترجمانی نہیں کرتے بل کہ وہ ابتدائی اسلامی عہد کے اُس اجتماعی مزاج کی عکاسی کرتے ہیں جس کی بنیاد ایمان، عزم اور بلند مقصد پر قائم تھی۔ اقبال طارق کے کردار کے ذریعے یہ دکھاتے ہیں کہ عظیم تبدیلیاں صرف مادی طاقت اور ظاہری وسائل سے نہیں بل کہ مضبوط ارادے، فکری پختگی اور مقصد پر کامل یقین سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہی وہ قوت تھی جس نے محدود وسائل رکھنے والی ایک قوم کو تاریخ کے اہم موڑ پر فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے قابل بنایا۔ نظم "طارق کی دعا (اندلس کے میدانِ جنگ میں)" کے درج ذیل اشعار اس جذبۂ یقین، شجاعت اور بلند مقصد کی ترجمانی کرتے ہیں:

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی(۵)

اقبال کی فکر میں خلافتِ راشدہ کا عہد ایک ایسے مثالی معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے جہاں عدل، مساوات، دیانت داری اور اجتماعی ذمہ داری بنیادی اقدار کے طور پر موجود تھیں۔ وہ اس دور کو محض ایک تاریخی واقعے کے طور پر بیان نہیں کرتے بل کہ اسے ایک فکری اور اخلاقی نمونے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک خلافتِ راشدہ کا امتیاز صرف سیاسی نظم یا حکومتی وسعت میں نہیں تھا بل کہ اس کی اصل بنیاد اُن اعلیٰ انسانی اصولوں میں تھی جنھوں نے معاشرے کے افراد کو ایک مشترکہ مقصد، مضبوط کردار اور اجتماعی شعور سے وابستہ رکھا۔ اقبال جب اس دور کا حوالہ دیتے ہیں تو ان کا مقصد مسلمانوں کو صرف ماضی کی عظمت یاد دلانا نہیں ہوتا، بل کہ وہ انہیں اپنی موجودہ کمزوریوں کا جائزہ لینے اور اپنی فکری و اخلاقی اصلاح کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ قوموں کی سربلندی کا راز صرف ظاہری طاقت، دولت یا مادی ترقی میں پوشیدہ نہیں ہوتا، بل کہ اصل قوت کردار کی مضبوطی، مقصد کی سچائی، باہمی اتحاد اور بلند اخلاق

اقدار سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اقبال مسلمانوں کو خلافتِ راشدہ کے اصولوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں تا کہ وہ اپنے زوال کے اسباب کو سمجھ سکیں اور اپنی اجتماعی زندگی کو بہتر بنیادوں پر استوار کر سکیں۔ اقبال کے نزدیک اس مقصد کے حصول کے لیے فرد اور قوم دونوں کو خودی کے ارتقائی مراحل سے گزرنا ضروری ہے۔ خودی کا تصور انسان کو اپنی صلاحیتوں کی پہچان، مسلسل جدوجہد، خود احتسابی اور بلند مقاصد کے حصول کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جب افراد اپنی خودی کو مضبوط بناتے ہیں تو یہی مضبوط کردار اجتماعی سطح پر ایک باوقار اور فعال قوم کی تشکیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح اقبال کے ہاں خلافتِ راشدہ کا تصور محض ماضی کی یاد نہیں بل کہ ایک ایسی فکری تحریک ہے جو حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

خودی کی جلوَتوں میں مُصطفائی
خودی کی خلوَتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کُرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خُدائی![۱]

اقبال کی شاعری میں اسلامی ماضی سے تعلق دراصل محض جذباتی وابستگی یا تاریخی فخر کا اظہار نہیں بل کہ ایک فکری اور تربیتی حکمتِ عملی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اقبال ماضی کی یاد کو اس لیے اہم سمجھتے ہیں کہ اس کے ذریعے حال کی کم زوریوں کا شعور پیدا کیا جا سکے اور قوم کے اندر وہی عزم، خود اعتمادی اور روحانی توانائی دوبارہ بیدار کی جا سکے جس نے ماضی میں مسلمانوں کو ترقی اور قیادت کی منزل تک پہنچایا تھا۔ ان کے نزدیک تاریخ کا مقصد صرف گزرے ہوئے زمانے کا بیان نہیں بل کہ اس سے رہ نمائی حاصل کر کے موجودہ حالات کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر کرنا ہے۔ اقبال کی شاعری میں مسلم تہذیب کے عروج کا ذکر بھی اسی مقصد کے تحت ملتا ہے۔ وہ اس عظمت کو محض ماضی پر فخر کرنے کے لیے پیش نہیں کرتے بلکہ اسے ایک تربیتی مثال کے طور پر استعمال کرتے ہیں تا کہ نئی نسل اپنی صلاحیتوں، اپنی فکری روایت اور اپنے تہذیبی ورثے سے آگاہ ہو سکے۔ اقبال کے نزدیک اسلامی تہذیب کی ترقی کا سبب صرف سیاسی اقتدار یا وسیع سلطنتیں نہیں تھیں، بل کہ اس کے پسِ پشت علم، تحقیق، تخلیقی سوچ اور فکری آزادی کا وہ جذبہ کارفرما تھا جس نے بغداد، قرطبہ اور دمشق جیسے مراکز کو علمی سرگرمیوں کے عظیم مراکز میں تبدیل کر دیا۔

اقبال بارہا اُس دور کی طرف توجہ دلاتے ہیں جب مسلمان سائنس، فلسفہ، طب، ریاضی، فلکیات اور دیگر علوم میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ترقی محض اتفاقی کامیابی نہیں تھی بل کہ ایک ایسی فکری بیداری کا نتیجہ تھی جس نے مسلمانوں کو کائنات کے مطالعے، تحقیق اور غور و فکر کی طرف راغب کیا۔ قرآن کی تعلیمات سے پیدا ہونے والے تدبر،

مشاہدے اور علم کی جستجو نے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا جس میں مذہب اور عقل کو ایک دوسرے کا مخالف نہیں بل کہ باہم معاون سمجھا گیا۔ اسی تاریخی شعور کی جھلک اقبال کی نظم "ذوق و شوق" میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اس نظم میں وہ مسلمانوں کے اُس تاریخی کردار کو یاد کرتے ہیں جس کے ذریعے ایک محدود خطے سے ابھرنے والی قوم نے انسانی تہذیب و تمدن کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ اقبال کے نزدیک یہ ماضی محض ایک گزرے ہوئے شان دار عہد کی یاد نہیں بل کہ ایک عملی مثال ہے کہ جب ایمان، علم اور مسلسل جدوجہد ایک دوسرے سے مربوط ہو جائیں تو کوئی قوم ترقی اور قیادت کی صلاحیت حاصل کر سکتی ہے۔ نظم "ذوق و شوق" کے بیشتر اشعار اقبال نے فلسطین کے سفر کے دوران تحریر کیے۔ اس نظم کے درج ذیل اشعار اسی جذبۂ عروج اور تاریخی شعور کی ترجمانی کرتے ہیں:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب!
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب![۷]

اقبال کے نزدیک مسلم تہذیب کے عروج کی ایک بنیادی وجہ اجتماعیت، باہمی اتحاد اور مشترکہ مقصد کا شعور تھا۔ مختلف خطوں، زبانوں، نسلوں اور ثقافتی پس منظر رکھنے والے مسلمان ایک مضبوط فکری اور روحانی رشتے کے ذریعے ایک ایسی اجتماعی وحدت میں منسلک ہو گئے تھے جس نے انہیں ایک مشترکہ تہذیبی شناخت عطا کی۔ اقبال کے نزدیک اس اتحاد کی بنیاد محض سیاسی وابستگی پر قائم نہیں تھی بل کہ ایک مشترکہ نظریے، اخلاقی اقدار اور بلند مقصدِ حیات پر استوار تھی۔ یہی اجتماعی شعور مسلمانوں کو علمی، فکری اور تہذیبی میدانوں میں غیر معمولی ترقی کی طرف لے گیا۔ اقبال کی نظر میں کسی بھی قوم کی قوت صرف افراد کی انفرادی صلاحیتوں میں نہیں بل کہ اُن صلاحیتوں کے اجتماعی نظم اور مثبت سمت میں استعمال ہونے میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ابتدائی اسلامی تاریخ میں یہی اجتماعی احساس موجود تھا جس نے مختلف علاقوں کے لوگوں کو ایک مقصد کے تحت متحد کیا اور انہیں ایک مضبوط تہذیبی قوت میں تبدیل کر دیا۔ اس کے برعکس اقبال مسلمانوں کے بعد کے زوال کو بڑی حد تک اسی اجتماعی وحدت کے کمزور پڑ جانے سے جوڑتے ہیں۔ ان کے نزدیک جب قومیں اپنے مشترکہ مقاصد، اخلاقی اصولوں اور اجتماعی ذمہ داری کے احساس سے دور ہو جاتی ہیں تو ان کی تخلیقی اور تعمیری قوت بھی بتدریج کم زور ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے اقبال اپنی شاعری میں اتحاد اور اجتماعی عمل پر مسلسل زور دیتے ہیں۔ وہ ماضی کے اس اتحاد کو صرف ایک تاریخی واقعے کے طور پر بیان نہیں کرتے بل کہ اسے موجودہ دور کے مسلمانوں کے لیے ایک سبق اور رہ نمائی کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ قومی ترقی اور تہذیبی احیا کے لیے افراد کو اپنی ذاتی ترجیحات سے بلند ہو کر ایک مشترکہ مقصد کے لیے کردار ادا کرنا ہو گا۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں(۸)

اس طرح اقبال کی شاعری میں مسلم تہذیب کے عروج کا بیان محض ماضی کی عظمت کے اظہار تک محدود نہیں رہتا بل کہ یہ ایک فکری اور تنقیدی آئینے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ماضی کے روشن ادوار کو سامنے رکھ کر موجودہ زوال کی وجوہات کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک تاریخ کا مقصد صرف کامیابیوں کا ذکر کرنا نہیں بل کہ ان عوامل کو سمجھنا بھی ہے جنھوں نے قوموں کو بلندی یا پستی کی طرف لے جانے میں کردار ادا کیا۔ اسی لیے مسلم تہذیب کے عروج اور زوال کا تقابل ان کی فکر میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے، جو آگے چل کر زوالِ امت کے اسباب کو سمجھنے کے لیے بنیادی نقطۂ آغاز فراہم کرتا ہے۔ جہاں اقبال مسلم تہذیب کے عروج کو ایمان، علم، عمل، اتحاد اور بلند مقاصد کی ایک روشن مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں، وہیں وہ اس کے زوال کا بھی نہایت گہرائی اور حقیقت پسندانہ انداز میں جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا انحطاط کسی ایک بیرونی طاقت یا محض تاریخی حادثے کا نتیجہ نہیں تھا، بل کہ اس کے پیچھے کئی داخلی کمزوریاں کارفرما تھیں۔ فکری جمود، عمل سے دوری، مقصدِ حیات سے غفلت اور اجتماعی شعور کا کمزور پڑ جانا وہ عوامل تھے جنھوں نے امت کی قوت کو متاثر کیا۔

اقبال کے نزدیک زوالِ امت کی سب سے نمایاں وجہ باہمی اتحاد کا فقدان تھا۔ ان کے خیال میں وہ قوم جو کبھی ایک مشترکہ عقیدے، مقصد اور اجتماعی شعور کے تحت متحد تھی، جب داخلی اختلافات، گروہی تقسیم اور ذاتی مفادات کا شکار ہوئی تو اس کی اجتماعی طاقت بھی کمزور پڑ گئی۔ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی سابقہ عظمت کا راز ان کی وحدت اور اجتماعی عمل میں پوشیدہ تھا، جب کہ زوال کا ایک بڑا سبب اسی وحدت کا بکھر جانا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی شاعری میں بار بار مسلمانوں کو اتحاد، اخوت اور مشترکہ مقصد کی طرف متوجہ کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی کھوئی ہوئی قوت کو دوبارہ حاصل کر سکیں۔ اقبال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا(۹)

قوم کو اتحاد، باہمی اخوت اور اجتماعی شعور کی بنیاد پر متحد رکھنا اقبال کی شاعری کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کسی بھی قوم کی ترقی اور سربلندی کا انحصار اس کے افراد کے درمیان موجود یکجہتی، مشترکہ مقصد اور باہمی اعتماد پر ہوتا ہے۔ اسی لیے اقبال اپنی شاعری میں بار بار مسلمانوں کو تفرقے سے بچنے، اجتماعی قوت کو مضبوط کرنے اور ایک مشترکہ

نصب العین کے تحت آگے بڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اتحاد محض ایک سماجی ضرورت نہیں بل کہ قومی زندگی کی بقا اور ترقی کی بنیادی شرط ہے۔ اسی تصور کو وہ ایک مقام پر نہایت مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا(۱۰)

اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کی ایک بنیادی وجہ تقلیدِ جامد اور اجتہادی فکر سے دوری تھی۔ ان کے خیال میں جس علمی جستجو، تحقیق، غور و فکر اور فکری آزادی نے کبھی مسلمانوں کو علمی و تہذیبی میدان میں نمایاں مقام عطا کیا تھا، وہی قوت بعد کے ادوار میں کمزور پڑ گئی۔ اقبال کے نزدیک جب کوئی معاشرہ نئے سوالات کا سامنا کرنے، حالات کا تجزیہ کرنے اور تخلیقی انداز میں سوچنے کے بجائے صرف ماضی کی روایات کی غیر تنقیدی پیروی پر اکتفا کر لیتا ہے تو اس کی فکری صلاحیت محدود ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں قوم کی تخلیقی توانائی کم زور پڑتی ہے اور وہ بدلتے ہوئے حالات میں مؤثر کردار ادا کرنے کی صلاحیت کھونے لگتی ہے۔

اقبال کے نزدیک امتِ مسلمہ کے انحطاط کا ایک اہم سبب داخلی اختلافات اور باہمی انتشار بھی تھا۔ وہ اس امر پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ جو امت کبھی ایک مشترکہ نظریے، مقصد اور فکری وحدت کے تحت متحد تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ، نسلی، لسانی اور علاقائی تقسیم کا شکار ہو گئی۔ اقبال کی نظر میں یہ انتشار صرف سیاسی کم زوری کا باعث نہیں بنا بل کہ اس نے مسلمانوں کی اجتماعی خودی کو بھی متاثر کیا، کیوں کہ اجتماعی قوت، اتحاد، نظم اور مشترکہ جدوجہد کے بغیر کسی قوم کی خودی مضبوط نہیں ہو سکتی۔

علامہ محمد اقبالؒ نے مسلمانوں کی سیاسی بے بسی، معاشی پسماندگی اور سماجی زوال کو نہایت گہرائی سے محسوس کیا۔ ان کی شاعری میں امتِ مسلمہ کے حالات پر گہری تشویش، دردمندی اور اصلاح کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ جب وہ مسلمانوں کی ماضی کی عظمت، علمی مقام اور تہذیبی کردار کو یاد کرتے ہیں تو موجودہ زبوں حالی کا احساس ان کے دل میں ایک گہری کسک پیدا کرتا ہے۔ یہی احساس ان کی نظم "خضرِ راہ" میں بھی نمایاں ہوتا ہے، جہاں وہ رہبر ملت کے ذریعے عالمِ اسلام کے مسائل، کم زوریوں اور زوال کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نظم "خضرِ راہ" کے عنوان "دنیائے اسلام" کے تحت درج ذیل اشعار میں اقبال کا یہی دردِ ملت اور اصلاحی جذبہ واضح ہوتا ہے:

کیا سناتا ہے مجھ کو ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز وساز

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز(۱۱)

اقبال کے نزدیک امتِ مسلمہ کے زوال کا ایک اہم سبب ذہنی اور روحانی غلامی بھی تھا۔ ان کے خیال میں صرف سیاسی محکومی ہی قوموں کی کم زوری کا باعث نہیں بنتی بل کہ اس سے زیادہ خطرناک صورت وہ ہے جب ایک قوم فکری طور پر دوسروں کی محتاج ہو جائے اور اپنی تہذیبی شناخت، اقدار اور تخلیقی صلاحیتوں پر اعتماد کھو بیٹھے۔ اقبال کے نزدیک مغربی افکار اور طرزِ زندگی کو بغیر غور و فکر کے قبول کرنے کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر احساسِ کم تری پیدا ہوا اور وہ اپنی فکری روایت سے دور ہوتے گئے۔

اقبال کے تصور میں کوئی بھی تہذیب اُس وقت تک زندہ اور متحرک نہیں رہ سکتی جب تک اس کے افراد اپنی داخلی قوت، اپنی خودی اور اپنے مقصدِ حیات سے آگاہ نہ ہوں۔ وہ مغربی تہذیب کی مادی ترقی کے معترف تھے، لیکن اس کے اُس پہلو پر تنقید کرتے تھے جہاں انسان روحانی اقدار سے کٹ کر محض مادی خواہشات کا تابع بن جاتا ہے۔ اسی طرح وہ مشرقی معاشروں میں پائے جانے والے جمود اور بے عملی کو بھی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اقبال کے نزدیک اسلامی تہذیب ان دونوں انتہاؤں سے بچتے ہوئے ایک متوازن تصور پیش کرتی ہے، جس میں انسان نہ تو مادیت کا غلام بنتا ہے اور نہ ہی تقدیر پرستی کا شکار ہوتا ہے، بل کہ وہ اللہ سے تعلق قائم رکھتے ہوئے دنیا میں فعال، تخلیقی اور ذمہ دار کردار ادا کرتا ہے۔

اقبال کا تصورِ مومن اسی متوازن شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے نزدیک حقیقی مومن وہ ہے جو روحانی وابستگی کے ساتھ ساتھ دنیاوی معاملات میں عمل، جدوجہد اور تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کرے۔ یہی روحانی آزادی انسان کو بلند کردار عطا کرتی ہے اور تہذیب کو مسلسل ارتقا اور تعمیر کی صلاحیت فراہم کرتی ہے۔ اسلامی تہذیب کی تجدید کے حوالے سے اقبال نے علم، فن اور فکر کے میدان میں ایک متوازن رویے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ وہ جدید سائنسی علوم کے مخالف نہیں تھے بل کہ ایسی ترقی کے ناقد تھے جو اخلاقی اور روحانی بنیادوں سے محروم ہو۔ ان کے نزدیک علم اگر انسانی خیر، اخلاقی ذمہ داری اور اعلیٰ مقاصد سے وابستہ نہ رہے تو وہ تباہی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ اسی لیے اقبال مسلمانوں کو جدید علوم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان علوم کو اسلامی اخلاقی شعور اور روحانی اقدار کی روشنی میں استعمال کیا جائے۔ ان کی شاعری میں علم اور عشق کا امتزاج اسی فکری توازن کی علامت ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک ایک مضبوط تہذیب وہی ہے جو عقل کی روشنی اور روح کی حرارت دونوں کو یک جا رکھتی ہے۔ اسی فکر کی ترجمانی اقبال کی نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں بھی ملتی ہے، جہاں وہ نوجوان نسل کو امت کے زوال کے اسباب سے آگاہ

کرتے ہوئے انہیں خود شناسی، بے داری اور عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک زوال کوئی دائمی حقیقت یا نا قابلِ تبدیلی حالت نہیں بل کہ ایک عارضی کیفیت ہے جس سے فکری بے داری، اجتہادی صلاحیت، کردار سازی اور اجتماعی اتحاد کے ذریعے نکلا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں وہ نوجوانوں کو اپنے اسلاف کے کردار، عظمت اور جدوجہد کی یاد دلاتے ہیں اور انہیں دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے موجودہ حالات کا موازنہ اپنے آباؤ اجداد کے عزم و کردار سے کریں۔ اگرچہ پوری نظم میں یہی پیغام نمایاں ہے، تاہم یہاں چند اشعار بطورِ مثال پیش کیے جاتے ہیں:

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سر دارا(۱۲)

اس طرح اقبال کا تاریخی تجزیہ محض ماضی کے زوال پر افسوس یا جذباتی اظہار نہیں بل کہ ایک باقاعدہ تشخیصی عمل ہے۔ وہ زوال کے حقیقی اسباب کو سامنے لا کر دراصل اصلاح اور احیا کی راہ متعین کرتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف کم زوریوں کی نشاندہی کرنا نہیں بل کہ اُن عوامل کی طرف رہ نمائی کرنا بھی ہے جن کے ذریعے قوم دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی قوت، اعتماد اور مقصد کو حاصل کر سکتی ہے۔

اقبال کی شاعری میں تاریخی شخصیات صرف ماضی کے کردار نہیں بل کہ زندہ اور متحرک علامتوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ ان شخصیات کے ذریعے اپنے عہد کے مسلمانوں کو عزم، عمل، جرأت اور خود اعتمادی کا پیغام دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک تاریخ کا اصل سبق صرف واقعات اور سنین یاد رکھنے میں نہیں بل کہ اُن عظیم کرداروں کو سمجھنے میں ہے جنھوں نے اپنے اعمال، بصیرت اور جدوجہد سے تاریخ کا رخ تبدیل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی نظموں میں مختلف تاریخی شخصیات کو بطور مثال پیش کرتے ہیں تا کہ بلند نظریات کو عملی نمونوں کے ذریعے واضح کیا جا سکے۔ اقبال کے نزدیک تاریخ کی طرف رجوع کا مقصد ماضی پرستی یا محض پرانی عظمتوں کی یاد نہیں بل کہ حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر ہے۔ وہ ماضی کی روشن مثالوں کو سامنے لا کر موجودہ نسل میں اعتماد اور عمل کی قوت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری میں ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک فکری رابطہ قائم نظر آتا ہے؛ ماضی سے حوصلہ حاصل کیا جاتا ہے اور مستقبل کے لیے نئی راہیں تلاش کی جاتی ہیں۔ اقبال کے تصورِ احیا کا پہلا مرحلہ خود شناسی ہے۔ ان کے نزدیک کوئی قوم اُس وقت تک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی تاریخ، اپنی صلاحیتوں اور اپنی کم زوریوں کا شعوری ادراک حاصل نہ کرے۔

اسی لیے اقبال نوجوان نسل کو بار بار اپنے تاریخی ورثے کی طرف متوجہ کرتے ہیں تاکہ وہ احساسِ کم تری سے نکل کر اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں اور خود کو ایک عظیم تہذیبی روایت کا امین سمجھیں۔

احیا کا دوسرا بنیادی پہلو عمل اور خودی کی تعمیرِ نو ہے۔ اقبال کے نزدیک تاریخ سے سبق حاصل کرنے کا مطلب صرف ماضی کے واقعات سے واقفیت حاصل کرنا نہیں بل کہ ان سے عملی رہنمائی لینا ہے۔ وہ مسلمانوں میں وہی عزم، اجتہادی صلاحیت، تخلیقی قوت اور خود اعتمادی دوبارہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو کبھی ان کی ترقی کا سبب بنی تھی۔ ان کے نزدیک قوموں کی تعمیر مسلسل جدوجہد، مضبوط کردار اور اپنی داخلی قوت پر یقین کے ذریعے ہوتی ہے۔ احیا کا تیسرا اہم پہلو اجتماعی وحدت کی بحالی ہے۔ اقبال مسلمانوں کے زوال کی ایک بڑی وجہ باہمی اختلاف اور انتشار کو قرار دیتے ہیں، اسی لیے وہ اپنی شاعری میں اتحاد، اخوت اور ملت کے مشترکہ تصور پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اجتماعی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب افراد ذاتی، علاقائی اور گروہی مفادات سے بلند ہو کر ایک مشترکہ مقصد کے لیے متحد ہوں۔

اقبال کا یہ پیغام ان کی نظموں میں ایک تحریکی انداز میں نمایاں ہوتا ہے۔ وہ صرف ماضی کی یاد نہیں دلاتے بل کہ نوجوان نسل کو براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے انہیں عمل، جدوجہد اور خود اعتمادی کی دعوت دیتے ہیں۔ اس طرح تاریخ اقبال کے ہاں محض ایک علمی موضوع نہیں رہتی بل کہ ایک زندہ فکری تحریک بن جاتی ہے جو ہر دور کے انسان کو یہ احساس دلاتی ہے کہ زوال آخری منزل نہیں، بل کہ درست شعور، مسلسل کوشش اور بلند کردار کے ذریعے عروج دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی پیغام کی جھلک نظم "ایک نوجوان کے نام" میں بھی نمایاں ہوتی ہے:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں (۱۳)

اقبال کی متعدد نظموں کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تاریخی شعور اُن کی شاعری میں کسی وقتی رجحان یا محدود موضوع کی حیثیت نہیں رکھتا بل کہ یہ اُن کے فکری نظام کا ایک مستقل اور نمایاں حصہ ہے۔ یہ شعور مختلف نظموں میں مختلف اسالیب اور زاویوں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ کہیں اقبال کسی تاریخی شخصیت کے کردار کے ذریعے اپنا پیغام پیش کرتے ہیں، کہیں براہِ راست خطاب کے انداز میں قوم کو متوجہ کرتے ہیں، اور کہیں تاریخ کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظم "طارق کی دعا" اس سلسلے میں ایک اہم مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں اقبال نے تاریخ کے ایک اہم واقعے کو بنیاد بنا کر اسے ایک وسیع تر انسانی پیغام میں تبدیل کر دیا ہے۔ طارق بن زیاد کی زبان سے ظاہر ہونے والا عزم، حوصلہ اور یقین دراصل اقبال کے اس تصور کی ترجمانی کرتا ہے کہ تاریخ کے بڑے فیصلے اُس وقت وقوع پذیر

ہوتے ہیں جب فرد یا قوم اپنی داخلی قوت، مقصد کی سچائی اور خودی پر مکمل اعتماد کے ساتھ میدانِ عمل میں اترتی ہے۔ اقبال کے نزدیک کامیابی کا اصل سرچشمہ محض ظاہری وسائل نہیں بل کہ مضبوط ارادہ اور بلند مقصد ہے۔

نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں تاریخی شعور ایک مختلف انداز میں سامنے آتا ہے۔ یہاں اقبال نوجوان نسل کو براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے انھیں اپنے شاندار ماضی اور موجودہ کمزوریوں کے درمیان فرق کا احساس دلاتے ہیں۔ اس نظم میں تاریخ محض تعریف یا فخر کا ذریعہ نہیں بل کہ اصلاح، بےداری اور عمل کی دعوت بن جاتی ہے۔ اقبال ماضی کی مثالوں کے ذریعے نوجوانوں میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ نظم "ذوق و شوق" میں تاریخی شعور ایک وسیع تر انسانی اور تہذیبی تناظر اختیار کر لیتا ہے۔ اس نظم میں اقبال مسلمانوں کی تاریخی جدوجہد کو عالمی تہذیبی ارتقا کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی تہذیب کا کردار انسانی تاریخ سے الگ کوئی محدود واقعہ نہیں بل کہ علم، فکر اور تمدن کی مجموعی ترقی کا ایک اہم باب ہے۔

اسی طرح نظم "مسجدِ قرطبہ" میں تاریخی شعور ایک گہری فلسفیانہ اور جمالیاتی شکل اختیار کرتا ہے۔ اقبال ایک تاریخی یادگار کے ذریعے وقت، فنا اور بقا کے مسائل پر غور کرتے ہیں۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ سیاسی اقتدار، سلطنتیں اور مادی نشانیاں وقت کے ساتھ ختم ہو سکتی ہیں، لیکن وہ اعلیٰ اقدار، تخلیقی جذبے اور فکری عظمتیں جو کسی تہذیب کی بنیاد بنتی ہیں، ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ اس طرح یہ نظم تاریخ کو صرف ماضی کے واقعات کے طور پر نہیں بل کہ انسانی روح کی مسلسل تخلیقی قوت کے طور پر پیش کرتی ہے۔

ان تمام نظموں کا مشترکہ پہلو یہ ہے کہ اقبال تاریخ کو ایک بند باب یا گزرے ہوئے زمانے کی داستان نہیں سمجھتے۔ ان کے ہاں تاریخ ہمیشہ حال سے گفت گو کرتی ہے اور مستقبل کے لیے رہ نمائی فراہم کرتی ہے۔ یہی خصوصیت اقبال کے تاریخی شعور کو محض ادبی موضوع سے بلند کر کے ایک زندہ فکری اور تحریکی فلسفے کی حیثیت عطا کرتی ہے۔ نظم "مسجدِ قرطبہ" کے درج ذیل اشعار اسی تاریخی شعور، بقا اور تخلیقی قوت کی ترجمانی کرتے ہیں:

قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردان حق وہ عربی شہسوار
حامل خلق عظیم صاحب صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب[۱۴]

اقبال کے نزدیک کسی قوم کی شناخت صرف جغرافیائی حدود، لسانی وابستگی یا نسلی امتیازات سے قائم نہیں ہوتی بل کہ اس کی اصل بنیاد اُس کے تاریخی شعور، اجتماعی تجربات اور مشترکہ یادداشت میں ہوتی ہے۔ اقبال کے فکری نظام میں تاریخ اور قومی تشخص کا تعلق نہایت گہرا ہے، کیوں کہ کسی بھی قوم کا اجتماعی شعور اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے ماضی، اپنے ارتقائی مراحل اور اُن اقدار سے آگاہ نہ ہو جنھوں نے اُس کی شخصیت کو تشکیل دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک جو قوم اپنے تاریخی پس منظر سے ناواقف ہو جاتی ہے، وہ رفتہ رفتہ اپنی شناخت اور اپنے مقصدِ وجود کے شعور سے بھی محروم ہونے لگتی ہے۔

اقبال کے تصور میں مسلمانوں کی اجتماعی شناخت کی بنیاد محض نسل، رنگ، زبان یا علاقائی وابستگی پر قائم نہیں بل کہ ایک وسیع تر نظریاتی اور تہذیبی رشتے پر استوار ہے۔ ان کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کا تصور جغرافیائی قومیت سے بلند تر ہے، کیوں کہ یہ ایک ایسے اجتماعی شعور کی نمائندگی کرتا ہے جو مشترکہ عقیدے، تاریخی تجربات، تہذیبی روایات اور مشترکہ مقاصد سے تشکیل پاتا ہے۔ اسی لیے اقبال مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو ایک ہی تاریخی سلسلے کی کڑیاں قرار دیتے ہیں، اگرچہ ان کی زبانیں، ثقافتیں اور جغرافیائی حالات ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک تاریخی شعور قومی تشخص کو دو بنیادی پہلوؤں سے مضبوط بناتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ یہ قوم کو اُس کے ماضی سے مربوط کر کے ایک تاریخی تسلسل کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس احساس کے ذریعے قوم یہ جانتی ہے کہ وہ کسی عارضی وجود کی حامل نہیں بل کہ ایک طویل فکری، تہذیبی اور تاریخی سفر کا حصہ ہے۔ دوسری طرف تاریخی شعور قوم کو مستقبل کے لیے سمت اور مقصد فراہم کرتا ہے، کیوں کہ ماضی کے تجربات ہی حال کے فیصلوں اور آنے والے وقت کی حکمتِ عملی مرتب کرنے میں رہ نمائی دیتے ہیں۔

اسی وجہ سے اقبال کی شاعری میں قومی تشخص محض سیاسی یا انتظامی مفہوم تک محدود نہیں رہتا بل کہ ایک گہرے تہذیبی، تاریخی اور روحانی شعور کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ان کے نزدیک مضبوط قومی شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ قوم اپنے تاریخی ورثے کو صرف یادگار کے طور پر محفوظ نہ رکھے بل کہ اسے اپنی اجتماعی خودی کا حصہ بنائے۔ یہی تاریخی وابستگی قوم کو حال کے مسائل کا مقابلہ کرنے کی قوت اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اعتماد عطا کرتی ہے۔

بے ذوقِ نمود زندگی، موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت پربت ضعفِ خودی سے رائی (۱۵)

اقبال کی وفات کو طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اُن کا تاریخی شعور آج بھی اپنی اہمیت اور معنویت برقرار رکھتا ہے۔ اُن کے عہد میں جن مسائل کی نشان دہی انہوں نے کی تھی، اُن میں سے کئی مسائل آج بھی مسلم معاشروں میں مختلف صورتوں کے ساتھ موجود ہیں، جن میں فکری تقلید، داخلی انتشار، تہذیبی مرعوبیت اور اجتماعی خودی کی کمزوری شامل ہیں۔ ایسے حالات میں اقبال کا تصورِ تاریخ محض ایک ادبی یا فلسفیانہ بحث نہیں رہتا بل کہ ایک ایسے فکری رہ نما اصول کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے جو قوموں کو اپنی شناخت، اپنے مسائل اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

موجودہ دور میں عالم گیریت اور تیز رفتار سماجی و ثقافتی تبدیلیوں نے دنیا کی بہت سی قوموں کے سامنے اپنی تہذیبی شناخت کے تحفظ کا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ ایسے ماحول میں اقبال کا یہ تصور خاص اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ کوئی بھی قوم اپنے تاریخی شعور کے بغیر اپنی اجتماعی خودی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ آج کی نوجوان نسل جب عالمی ثقافتی اثرات اور معلومات کے بے شمار ذرائع کے درمیان اپنی شناخت کے سوال سے دوچار ہے، تو اقبال کا اپنی تاریخ، تہذیبی ورثے اور فکری بنیادوں سے وابستگی کا پیغام ایک اہم رہ نمائی فراہم کرتا ہے۔ تاہم اقبال کے نزدیک تاریخ سے تعلق کا مطلب ماضی میں قید ہو جانا یا محض پرانی روایات کی تقلید کرنا نہیں ہے۔ وہ تاریخ کو ایک ایسے سرچشمے کے طور پر دیکھتے ہیں جہاں سے قومیں تجربہ، بصیرت اور تحریک حاصل کر سکتی ہیں۔ ان کے نزدیک درست رویہ یہ ہے کہ ماضی کے تجربات سے سبق حاصل کرتے ہوئے حال کے مسائل کا تخلیقی اور اجتہادی انداز میں سامنا کیا جائے۔ یہی طرزِ فکر مسلم معاشروں کے لیے ایک متوازن راستہ پیش کرتا ہے؛ ایسا راستہ جو نہ اندھی ماضی پرستی پر قائم ہو اور نہ اپنی تہذیبی بنیادوں سے کٹ کر غیر شعوری تقلید کو اختیار کرے۔ اسی طرح اقبال کا اتحاد اور اجتماعی شعور پر زور دینا بھی عصرِ حاضر میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ موجودہ دور میں جب مسلم دنیا مختلف سیاسی، سماجی اور نظریاتی تقسیموں کا سامنا کر رہی ہے، اقبال کا یہ پیغام کہ اجتماعی قوت اور وحدت ہی احیا کا بنیادی ذریعہ ہیں، ایک مؤثر فکری رہ نمائی فراہم کرتا ہے۔ ان کا تاریخی شعور موجودہ مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کے لیے ایک ایسا زاویۂ نظر پیش کرتا ہے جس میں ماضی کے تجربات، حال کے تقاضے اور مستقبل کے امکانات ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔

اقبال کا تاریخی شعور کسی مخصوص زمانے یا حالات تک محدود نہیں بل کہ ایک وسیع اور ہمہ گیر فکری اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہر دور کی قوموں کو یہ سبق دیتا ہے کہ حقیقی ترقی، خود اعتمادی اور احیا کا راستہ اپنی تاریخ کے شعوری ادراک، اپنی تہذیبی شناخت کے تحفظ اور ماضی سے حاصل ہونے والی تعمیری تحریک کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اسی فکر کی ترجمانی اقبال کی نظم "بانگِ درہ" کے درج ذیل اشعار میں بھی ملتی ہے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر(۱۶)

اقبال کے نزدیک تاریخ محض ماضی کے واقعات، شخصیات اور حادثات کی ترتیب وار روداد نہیں بل کہ ایک زندہ اور فعال قوت ہے جو فرد اور قوم دونوں کی فکری تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ انہوں نے تاریخ کو اپنے فلسفۂ خودی کے ساتھ اس طرح مربوط کیا کہ دونوں تصورات ایک دوسرے کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں۔ خودی انسان اور قوم کو مقصد، شعور اور عمل کی قوت عطا کرتی ہے، جب کہ تاریخ اسے تجربہ، شناخت اور جدوجہد کا سرمایہ فراہم کرتی ہے۔ اس طرح اقبال کے ہاں تاریخ اور خودی کا تعلق محض نظری نہیں بل کہ ایک متحرک اور تعمیری رشتہ ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی تاریخ کے روشن ادوار، مسلم تہذیب کے علمی و فکری عروج اور امتِ مسلمہ کے زوال کے اسباب کو گہرے تاریخی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا انحطاط کسی ایک بیرونی سبب یا محض سیاسی حادثے کا نتیجہ نہیں تھا بل کہ اس کے پسِ پشت داخلی کم زوریاں کارفرما تھیں، جن میں فکری جمود، اندھی تقلید، باہمی انتشار اور ذہنی غلامی نمایاں تھیں۔ اسی لیے اقبال کے نزدیک احیا کا راستہ بھی بیرونی عوامل سے زیادہ اندرونی اصلاح، اجتہادی فکر، خود اعتمادی اور اجتماعی اتحاد سے وابستہ ہے۔ اقبال کی فکر کا ایک بنیادی پہلو یہ بھی ہے کہ تاریخی شعور اور قومی تشخص ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ ان کے نزدیک کسی قوم کی شناخت صرف موجودہ حالات سے نہیں بنتی بل کہ اس کے تاریخی تجربات، تہذیبی روایات اور اجتماعی یادداشت سے تشکیل پاتی ہے۔ یہی شعور قوم کو اپنی اصل پہچان سے آگاہ کرتا ہے اور اسے مستقبل کے لیے درست سمت اختیار کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اقبال کا تاریخی پیغام آج بھی اپنی معنویت برقرار رکھتا ہے، خصوصاً ایسے دور میں جب مسلم معاشرے فکری تقلید، تہذیبی مرعوبیت اور داخلی تقسیم جیسے مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔

اقبال کی شاعری میں تاریخی شعور محض ایک ادبی موضوع یا فلسفیانہ تصور نہیں بل کہ ایک عملی اور تحریکی نظریہ ہے۔ یہ نظریہ فرد اور قوم کو اپنی تاریخ کے شعوری مطالعے، اپنی صلاحیتوں کے ادراک اور اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے جدوجہد کا پیغام دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک عروج کی طرف واپسی اسی وقت ممکن ہے جب کوئی قوم اپنے ماضی کو سمجھ کر اس سے قوت حاصل کرے، حال کے تقاضوں کو پہچانے اور مستقبل کی تعمیر کے لیے عزم، یقین اور عمل کا راستہ اختیار کرے۔

حوالہ جات

۱۔ خلیفہ عبدالحکیم، رومی، نطشے اور اقبال، مقالاتِ حکیم، جلد دوم، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص:۲۶۹

۲۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر، بالِ جبریل، کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۳۵ء، ص:۷۰

۳۔ ایضاً، ص:۶۹

۴۔ فیض احمد فیضؔ، ماہ نامہ، نقوش، لاہور، شمارہ ۱۲۳، ص:۱۲۴

۵۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر، بالِ جبریل، ص:۱۴۲

۶۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر، کلیاتِ اقبال اردو، طبع سوم، شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۸۳

۷۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر، کلیاتِ اقبال، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص:۴۰۳

۸۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر، بانگِ درا، مکتبہ دانیال، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص:۱۴۵

۹۔ ایضاً، ص:۱۳۷

۱۰۔ ایضا، ص ۱۴۴

۱۱۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر، کلیاتِ اقبال، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص:۲۵۵

۱۲۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر، بانگِ درہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص:۱۸۰

۱۳۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر، بالِ جبریل، ص:۱۶۲

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۳۳

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۵۶

۱۶۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر، بانگِ درہ، ص:۲۶۵

Reference:

1. Khalifa Abdul Hakim, Rumi, Nietzsche aur Iqbal, Maqalat-e-Hakim, Jild Doam, Idara-e-Saqafat-e-Islamia, Lahore, 1969, p: 269.
2. Allama Iqbal, Dr., Bal-e-Jibril, Kapoor Art Printing Works, Lahore, 1935, p: 70.
3. Ibid, p: 69.
4. Faiz Ahmad Faiz, Mahnama Naqoosh, Lahore, Shumara 123, p: 124.
5. Allama Iqbal, Dr., Bal-e-Jibril, p: 142.
6. Allama Iqbal, Dr., Kulliyat-e-Iqbal Urdu, Taba Som, Sheikh Ghulam and Sons, Lahore, 1996, p: 83.
7. Allama Iqbal, Dr., Kulliyat-e-Iqbal, Educational Publishing House, Delhi, 2014, p: 403.

8. Allama Iqbal, Dr., Bang-e-Dara, Maktaba-e-Danial, Lahore, 2018, p: 145.
9. Ibid, p: 137.
10. Ibid, p: 144.
11. Allama Iqbal, Dr., Kulliyat-e-Iqbal, Educational Publishing House, Delhi, 2014, p: 255.
12. Allama Iqbal, Dr., Bang-e-Dara, Sheikh Ghulam Ali and Sons, Lahore, 1977, p: 180.
13. Allama Iqbal, Dr., Bal-e-Jibril, p: 162.
14. Ibid, p: 133.
15. Ibid, p: 156.
16. Allama Iqbal, Dr., Bang-e-Dara, p: 265.